Category Y

AL-HAYAT Research Journal

ISSN (Online): 3006-4767
ISSN (Print):: 3006-4759

Volume 3 Issue 1 (October-December 2025)

# اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدم، جوش ملیح آبادی۔اردو رومانیت کے علمبردار

# Akhtar Sheerani, Hafeez Jalandhari, Abdul Hameed Adam, and Josh Malihabadi — the pioneers of Urdu Romanticism

**Dr. Muzamil Bhatti**
Professor, National College of Business Administration & Economics, Sub Campus Bahawalpur

**Zahida Parveen**
PhD Scholar Urdu, National College of Business Administration & Economics Sub Campus Bahawalpur

**Fouzia Nasim**
PhD Scholar Urdu, National College of Business Administration & Economics Sub Campus Bahawalpur

**Abstract**
Romanticism in literature is the reaction of classicism. It is a strange treatment of beauty. The Key points of Romanticism are feelings instead of thoughts, easy language instead difficult phrase, village life instead of city life, no strict observation of rhyme scheme, patriotism and nostalgia. In English poetry this movement started in 1798 in reaction to classicism with the publication of Lyrical Ballads by Wordsworth and Coleridge. In Urdu Poetry it is the reaction of literature for the sake of life and preaching of social and moral values by Ali Garh Movement. Sir Syed and his fellows emphasis on prose and Nazm in poetry. The literature created by them lost charm and delicacy. It became monotonous and people were fed up by this kind of literature. So, poets like Josh Malihaabadi, Hafeez Jalandhry , Abdul Hameed Adam and Akhtar Sherani began to write on the topics which had a special attraction for the people. Akhtar Sherani portrayal of village scenes and his sonnets made him a great romantic poet. From 1890 onward the romantic poetry was written till the beginning of Progressive Movement in Indian in 1936.

**Keywords:** Romanticism, Classicism, Sonnet, Progressive Movement

اردو رومانوی شاعری کا پس منظر

جنگ آزادی نے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی تشخص کو تقریباً مسخ کر دیا تھا۔ ہندو اور مسلمان اپنی جداگانہ حیثیت کھو چکے تھے۔ ان کا مکمل نظام حیات انگریزوں کے تسلط میں آچکا تھا۔ ان حالات میں سیاسی اور مذہبی بیداری ایک فطری عمل تھا۔ سر سید احمد خان اور اس کے رفقائے کار نے حتی الامکان کوشش کی کہ انگریزوں کی مخالفت کیے بغیر مسلمانوں کے وجود کا بچایا جاسکے۔ اصلاحِ معاشرہ کی کوشش تیز کر دی گئی۔ سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ادبی تحریک کا مقصد بھی اصلاحِ معاشرہ تھا اور فن برائے زندگی کا تصور شدت اختیار کرنے لگ گیا۔ علی گڑھ تحریک کے دور میں جتنا ادبی کام ہوا اس کا بنیادی مقصد ادب کے ذریعے لوگوں کو اپنا ماضی یاد دلانا اور ان کے لیے اسلاف کے کارناموں کو سامنے لانا تھا۔ اصلاحی مضامین کا موضوع مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی وہ نئی برائیاں اور خرابیاں تھیں جنہوں نے اسلامی معاشرے کے ڈھانچے کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ عبادات سے دوری اور مادیت پرستی نے مسلمانوں کو حقیقی اسلام سے کافی دور کر دیا تھا۔ یہ وہ سیاسی حالات تھے جن سے ادب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ادب برائے ادب کا تصور کچھ عرصے کے لیے ماند سا پڑ گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو اپنی علیحدہ شناخت کا احساس ہوا اور اسی احساس کے زیر اثر پیدا ہونے والی تحریکوں میں قدیم مذاہب کے احیا کو تقویت ملی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علی گڑھ کی حقیقت پسندی کی تحریک مذہب سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ مذہب اور اخلاقیات جو انگریزوں کے نشانے پر تھے انہیں زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پرانی روایات اور قدیم اقدار کے خلاف نوجوانوں کا ردعمل رومانوی تصورات کی صورت میں سامنے آیا۔ اس تصور نے قدیم بتوں کو پاش پاش کرنے، اپنے اندر کی آواز کو سننے، اپنی شخصی آزادی کو محسوس کرنے اور تخیل کی نئی کونپلوں کو کھلنے پر آمادہ کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ رومانیت کی بنیادی وجہ سائنس کی ترقی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس نے انسانی تخیل اور روحانی قوت کے وجود کو پارا پارا کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خوب سے خوب تر جہان تخلیق کرنا رومانیت کا ایک پر اسرار مگر اہم مقصد ہے اور ہندوستانی فرد میں یہ جذبہ حصول آزادی کی آرزو کی صورت میں بدرجہ اتم پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم سائنس نے انسان کے یقین کو پارا پارا کیا تو اس عمل میں اولین سطح پر اس کی شخصی انا مجروح ہوئی۔ ثانیاً وہ نیابت الٰہی کی بلند مسند سے اتر کر زمین پر گر پڑا۔ ثالثاً زمین کے ثقافتی بوجھ سے گریز کرنے اور ایک آزاد فضا میں سانس لینے پر آمادہ ہو گیا۔ بقول سدید[۴]:

"بیسویں صدی میں فرد کی بے بسی رومانیت کے فروغ میں خاصی معاون نظر آتی ہے اور یہ کہنا درست ہے کہ



CC BY

بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر میں ایسی فضا مرتب ہو چکی تھی جس میں رومانیت پھل پھول سکتی تھی۔"

اردو ادب میں رومانوی شاعری کی روایت سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ رومانیت کیا ہے؟ کیا یہ صرف عشق و محبت کی کہانیوں کا نام ہے یا پھر کسی قسم کی انفرادیت رومانیت کہلاتی ہے؟ اسے مختلف نقادوں نے مختلف انداز میں برتا ہے۔ ہر نقاد نے اس کے مختلف مفہوم اخذ کیے ہیں لیکن کسی ایک نکتہ پر کوئی بھی متفق نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ رومانیت کا کوئی واضح اور اصطلاحی مفہوم موجود نہیں۔ حتیٰ کہ ہم اس کی تعریف کسی ایک لفظ میں بھی نہیں کر سکتے۔ اسے مختلف رجحانات اور میلانات کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے:

بقول سلام[1]:

"کسی نقاد نے سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت اور عوام کی بیداری کی آواز کو رومانیت کہا ہے تو کسی
کے نزدیک محبت۔ عشق اور آزادی ہی رومانیت کے ہم معنی قرار پاتی ہے۔ یہ آزادی خواہ شخصی ہو یا اجتماعی۔
اور یہ عشق خواہ بنی نوع انسان سے ہو یا سلمیٰ یا عذرا سے، بہر طور یہ رومانیت ہے۔ کہیں یہی رومانیت
فطرت پرستی کا روپ دھار لیتی ہے تو کہیں تخیل و جذبات کی حسین وادیوں، دلفریب مناظر اور خوش گوار
تنہائیوں میں متشکل ہو کر رونما ہوتی ہے تاہم رومانیت کی اساس جذبات و احساسات کی فراوانی پر ہے
اور اس کی دیدہ زیب عمارت قائم حسن و جوانی پر ہے۔"

جس طرح انگریزی ادب میں رومانوی تحریک کلاسیک تحریک کا ردعمل تھی اسی طرح اردو ادب میں رومانوی تحریک کا آغاز بھی ایک ردعمل کی صورت میں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ اور ان کے ہم عصروں نے جس طرح سائنس، مقصدیت، فلسفہ، منطقیت، عقلیت پسندی اور اصلاح پر زور دیا اس کے خلاف آہستہ آہستہ بیزار کن یکسانیت و انجماد اور غیر معمولی سنجیدگی کو تقویت ملی۔ اسلوب کا یہ انداز عام قاری کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ٹکرایا۔ خشک اور غیر دلچسپ تحریروں میں عام قاری کی دلچسپی ماند پڑتی گئی۔ ادب کے ارکان خمسہ نے اس وقت ملی فلاح کے کاموں کا آغاز کیا جب قابض قوتوں نے برصغیر کے معاشرتی، سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی شعبوں کو انہدام کے قریب پہنچا دیا تھا۔ ان حالات میں سرسید احمد خان اور باقی رفقا کار نے سائنسی انداز فکر اپناتے ہوئے تخلیقی ادب میں عقلیت، اجتماعیت اور حقیقت نگاری کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اس طرح کے رجحان کو عام طور پر کلی رجحان نہیں کہا جاتا۔

ادب میں اس چیز کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ کوئی بھی تحریک اپنے اندر ایسے عناصر ضرور پیدا کر جاتی ہے جس کا ردعمل ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ اس ردعمل کا ردعمل بھی یقینی ہوتا ہے۔ انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی ہر تحریک پچھلی تحریک کے خلاف ایک بغاوت ثابت ہوتی ہے۔ اردو ادب میں سرسید احمد خاں اور حالی کی اصلاحی تحریک کا ردعمل رومانوی تحریک ہے۔ بقول سدید[2]:

"اس تحریک نے ایک فوج کی طرح پیش قدمی کر کے قدیم پر فتح یاب ہونے کی کوشش کی، جذبے کو بلند پروازی سکھائی۔ ادیب کو اندر کی کائنات سے متعارف کرایا، اور نئے لفظ اور جدت آفریں خیال کے امتزاج سے روح پرور ادب تخلیق کیا۔"

سرسید احمد خاں اور اس کے رفقائے کار نے برصغیر کے مخصوص سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کے پیش نظر اصلاحِ معاشرہ کے لیے اقدامات اٹھائے۔ اس دور میں جو بھی ادب تخلیق ہوا اس میں مقصدیت، عقلیت، منطقیت اور حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں تھا۔ علی گڑھ دور میں نثر کو فروغ ملا اور اس ضمن میں انشاپردازی پر زیادہ زور دیا گیا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں معاشرے کی اصلاح کے لئے مضامین لکھے گئے۔ اس تحریک کے دوران ہی انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں میں ہمیں فطری نظم کے نمونے نظر آئے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں پر انگریزی ادب کا رنگ غالب نظر آیا۔ ان نظموں میں موضوعات کا انتخاب کیا گیا اور فطرت کی دلکش عکاسی کی گئی۔ کچھ عرصہ کے لئے غزل ماند پڑ گئی اور نظم کو فروغ ملا۔ انجمن پنجاب لاہور کے مشاعرے اور علی گڑھ تحریک کا فن برائے زندگی پر زور نے رومانوی تحریک کی راہیں ہموار کیں۔ اگرچہ یہ تحریک کسی سیاسی کوشش اور سوچ کے ساتھ معرض وجود میں آئی لیکن اسے اردو ادب کی بہت بڑی تحریک قرار دیا جا سکتا ہے۔

رومانیت حقیقت میں میانہ روی، عقلیت اور اصول پرستی کے خلاف ایک کھلم کھلا بغاوت ہے۔ کلاسیک دور کا انسان زندگی اور ادب کو کچھ مخصوص خانوں میں بانٹ کر اور چند فرسودہ اصولوں میں تقسیم کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ادب زیادہ دیر تک بے جا پابندیاں اور فرسودہ جکڑ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ادب ایک آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کلاسیکی دور میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ جلد ہی فن برائے زندگی سے فن برائے فن کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انگریزی اور اردو ادب میں رومانوی تحریکوں کا پس منظر تھوڑا سا مختلف سہی لیکن کافی حد تک ایک جیسا ہے۔ دونوں تحریکیں ادب کو گھٹن زدہ ماحول سے آزاد کرانے کی کوشش تھیں۔ رومانیت نے کلاسیک پر وہ کاری ضرب لگائی جس کے اثرات بعد میں بہت عرصہ تک محسوس ہوتے رہے۔ یہ تحریک چند نوجوان شاعروں کا جذباتی ابال نہ تھی

بلکہ ایک منظم معاشرتی نظام کی ضرورت تھی۔ اب کا معاشرتی نظام پرانے اصولوں پر کاربند رہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ دنیا میں بہت بڑے انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب اور انقلابِ فرانس کے ساتھ ساتھ برصغیر میں جنگِ آزادی نے دنیا کا نقشہ یکسر بدل دیا تھا۔ اصول و ضوابط کے پرانے سانچے بے جان ہو رہے تھے اور نیا نظام نئے اصول مانگ رہا تھا جس میں کم از کم شخصی آزادی کی یقینی دہائی کرائی گئی ہو۔ پرانے اصول اور دستور نئے زمانے کی حقیقتوں کے لیے مفلوج ہو چکے تھے اور جدید انسان کا ہتھیار بننے کی بجائے اس کے لئے زنجیر بن چکے تھے۔ یہ بات غلط ہے کہ رومانیت حقیقت کی دنیا سے فرار ہے۔ یہ ایک نئی کائنات کی تلاش بھی ہے اور نئی قدروں کی بازیافت بھی۔ یہ ایک ایسی تگ و دو تھی جس میں کسی نہ کسی طرح زمانہ ماضی کے جامد

اصولوں کو توڑا جاسکے—روسو نے انسان کی آزادی کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس نے نہ صرف معاشی اور معاشرتی لحاظ سے تہلکہ مچادیا بلکہ اس نے ادب میں نئی روح پھونک دی—انہیں یہ اصول بہت بھایا کہ انسان کائنات کے لئے نہیں ہے بلکہ کائنات انسان کے لیے ہے-اگرچہ روسو کا میدان سیاست اور عمرانیات تھا لیکن ادب کے اندر پرانے سانچوں کی سرتابی کی کوشش میں اس نے اہم کردار ادا کیا—کلاسیک کے نزدیک دل ایک ایسی چیز ہے جس پر قابو پایا جاسکتا ہے—وہ دل پر دماغ کی حکمرانی کے قائل تھے-ان کے نزدیک دل کو مشینوں کی طرح اپنی مرضی کے مطابق چلایا جاسکتا ہے—جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا—کیونکہ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے—اس کی اپنی ایک آزاد سوچ ہے،اس کی اپنی ایک آزاد دل کی دنیا ہے-اس کے جذبات ہی اسے زندگی میں قوت اور تقویت فراہم کرتے ہیں-کلاسیک دور میں تخلیق ہونے والا ادب خالصتاً دماغ کی پیداوار تھا-وہ دلی جذبات کو ایک بیماری قرار دیتے تھے—ان کے نزدیک ایک ایسا شخص جو جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو عملی زندگی میں حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا—وہ یہ بھی مانتے تھے کہ جذبات کا بے قابو بہاؤ مادی زندگی کی کامیابی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے—انہوں نے صرف اور صرف دماغ سے سوچا اور دماغ ہی سے محسوس کیا-انہوں نے ادب کو صرف اور صرف ادیبوں کی حد تک محدود کر دیا تھا—

مشکل اور پیچیدہ تراکیب عام قاری کی سمجھ سے بالاتر تھیں-وہ سمجھتے تھے کہ ادب جتنا ناقابل فہم ہوگا اتنا ہی عظیم ہوگا-الفاظ کے مشکل استعمال کے ساتھ ساتھ وہ صنائع بدائع کے اس حد تک قائل تھے کہ ادب کے اندر مصنوعی پن کی واضح جھلک نظر آتی تھی-شاعری میں مصرعوں کو وہ ترازو پر تولتے تھے اور جب تک دونوں مصرعوں کے پلڑے برابر نہیں ہوتے ان کے نزدیک وہ شعر کہلوانے کا حقدار نہیں ہوتا تھا—وہ اس شاعر کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے جسے ادبی اصطلاحات، مشکل تراکیب اور علمِ عروض کا علم نہ ہو—وہ ہر اس شعر کو رد کرتے تھے جو ان کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر پورا نہیں اترتا تھا-اس گھٹن زدہ ماحول میں ادب کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا اور رومانوی شعرا نے اسے وہ آزاد دنیا دکھائی جہاں خیالات کی بجائے جذبات کی فرمانروائی تھی —جہاں حقیقت کی دنیا کی نسبت تخیل کی دنیا زیادہ پرکشش تھی—جہاں الفاظ کا گورکھ دھندہ شاعری کے لیے زیادہ ضروری نہیں تھا—جہاں ادب ادیبوں کے اپنے قائم کردہ حلقوں سے نکل کر عام لوگوں کی دہلیز تک پہنچا-شاعری اب آسان اور سادہ الفاظ میں ہونے لگی-جس سے عام قاری کی بھی ادب میں دلچسپی بڑھ گئی-رومانیت نے نہ صرف ادب کو نئے شاعر دیے بلکہ نئے قاری بھی-شاعری کا مقصد بھی تبدیل ہو گیا—اب شاعری معاشرے کی اصلاح کی بجائے شاعر اور قاری دونوں کے لیے مسرت اور شادمانی کا ذریعہ بن گئی— تخیل نے انسان کو جزوقتی فرار عطا کیا جو ایک نعمت خداوندی سے کم نہ تھا—یہ الزام غلط ہے کہ رومانوی شعرا دنیا کی حقیقتوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور ان میں حقیقت کی دنیا کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں-بلکہ وہ دانستہ طور پر کچھ لمحوں کے لیے زندگی کی تلخیوں کو بھلانا چاہتے تھے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے-جدید دنیا کی مادیت پرستی نے انسانی ذہن کو جس طرح مافوق کر دیا ہے اس سے کچھ لمحوں کے لئے چھٹکارا پانا کوئی قابل اعتراض عمل نہیں—جدید انسان دنیا کے ہنگاموں میں اس حد تک کھو گیا تھا کہ اسے صرف کمانے اور خرچ کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا—اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی فطرت کی خوبصورت اور رنگین دنیا بے معنی ہو کر رہ گئی تھی—وہ صرف اور صرف دولت کا پجاری بن گیا-اس کا اوڑھنا بچھونا دولت اور صرف دولت بن گیا—اسے نہیں معلوم کہ وہ فطرت کی دنیا کی طرف توجہ نہ کر کے اپنی توانیاں ضائع کر رہا ہے—وہ فطرت میں موجود قوت بخش عناصر کی تسکین سے محروم ہو چلا تھا—فرانس میں رومانوی تحریک اٹھارویں صدی میں شروع ہوئی لیکن اردو ادب میں رومانیت کا دور ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کا دور ہے-بقول صدیقی (۳)

> ”فرانسیسی ادب میں یہ تحریک اٹھارویں صدی میں رونما ہوئی لیکن اردو میں رومانوی تحریک کے اثرات
> انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں اس وقت ظاہر ہوئے جب ہندوستان
> انگریزوں کا غلام ہو گیا۔“

اس کم عرصے میں بھی اس تحریک نے ادب میں وہ انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جنہیں اب تک محسوس کیا جارہا ہے—اس نے تخلیقی ادب میں اجتماعی شعور وادراک اور اسالیبِ شعر پر جو اثرات مرتب کیے ہیں تاریخ ادب انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گی—

اپریل ۱۹۰۱ میں مخزن کا اجرا ہوا جس نے روایت سے ہٹ کر نوجوانوں کے جذبات کی ترجمانی شروع کر دی-مخزن سے منسلک سرفہرست ادیبوں میں اقبال شامل ہیں اور ابتدا میں اقبال نے کافی رومانوی شعر بھی لکھے-مخزن کی ادبی تحریک کو رومانیت کی پہلی اینٹ کہا جاسکتا ہے-اگرچہ کچھ عرصے بعد مخزن کی تحریک دھیمی پڑ گئی لیکن لطافت اور رومانیت کی جس تحریک کو مخزن نے فروغ دیا تھا وہ ختم ہونے کی بجائے اور پھیلتی گئی-اور اب یہ رومانوی تحریک ان نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی جو انگریزی علوم سے واقف تھے اور جنہوں نے اسلوب اور ہیت کے نئے تجربات کیے-اس طرح رومانوی تحریک کا دائرہ کار شاعری سے ہوتا ہوا دوسری اصناف تک بڑھ گیا —

یہ ایک حقیقت ہے کہ رومانیت کے عناصر اردو شاعری میں روزِ اول ہی سے موجود تھے—ابتدا میں ان کی کوئی ترتیب نہ تھی لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں اردو غزل کی بجائے اردو نظم کو فروغ ملا—زندگی میں انفرادیت کی پہچان نکھر کر سامنے آنے لگی اور اس پہچان میں اردو نظم نے اہم کردار ادا کیا—

بقول سدید (۲):

> ”اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رومانیت کے عناصر اردو شاعری کی گھٹی
> میں موجود تھے—تاہم ابتدا میں یہ عناصر بڑی حد تک بکھرے ہوئے تھے اور کسی ایسے منظم طرز احساس
> سے نہیں پھوٹے تھے جو شاعر کی شخصیت کا جزو بن چکا ہو۔“


CC BY

اردو نظم نے اردو غزل کے اوصاف کو مجروح نہ کیا—بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے نئے آفاق سے روشناس کرانے میں مدد دی —انجمن پنجاب کی تحریک کے دوران اردو نظم اور اردو غزل کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے—لیکن رومانوی تحریک نے ان فاصلوں کو سمیٹ دیا—کیونکہ رومانیت میں اظہارِ سخن کے لیے غزل اور نظم دونوں مناسب تھیں—اردو رومانوی شاعر عبدالحمید عدم کا بیشتر سرمایہ ادب غزل پر مشتمل ہے—جبکہ اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی—اختر شیرانی نے تو انگریزی طرز پر سانیٹ لکھنے کی بھی کوشش کی اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے—اردو ادب کے رومانوی شعرا میں حفیظ کو یہ مقام حاصل ہے کہ انہوں نے زندگی کے باریک مادی ذرے سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی-حفیظ کی شاعری کے بیشتر ماخذات مشرقی ہیں-حفیظ کی رومانیت ان معصوم حیرتوں سے عبارت ہے جو ان کے دل کے چاروں طرف حسن و جمال کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے—ان کی رومانیت کا بہترین اظہار ان کی غنایت میں ہوا ہے-انہوں نے فطرت کے جو نغمے گائے ہیں وہ روح میں اتر جاتے ہیں—حفیظ نے روحِ انسانی کی نازک لرزشوں کو جن میں ہلکی سی ایک لہر غم بھی ہے، جگادیا ہے—حفیظ کے بعد اردو رومانوی شاعری میں جو نام سامنے آتا ہے وہ جوش ملیح آبادی کا ہے۔—

بقول سدید[۲]:

"رومانوی تحریک کے شعرا میں سے جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کی آواز میں اتنا جادو تھا کہ اس کا تاثر
لمبے عرصے تک نوجوانوں کو مسحور کرتا رہا-چنانچہ ان کی تقلید نئے شعرا کے ایک بڑے طبقے نے کی—جوش کی عطا یہ ہے
کہ انھوں نے مردانہ لہجے میں نعرہ لگانے کا اسلوب پیدا کیا اور الفاظ اور تراکیب کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم کر دیا—اختر شیرانی نے نسوانی حسن کو آشکار کیا—"

اردو ادب کے افق پر جتنی بھی تحریکیں نمودار ہوئیں ان کے اثرات صرف اس دور تک محدود رہے-ان کے پس منظر میں چند سیاسی اور سماجی عوامل کارفرما تھے-وہ پورے معاشرے کی نمائندگی کر رہی تھیں-لیکن رومانوی تحریک میں اجتماعیت سے زیادہ انفرادیت کا عنصر کارفرما تھا-رومانوی شعرا نے معاشرے کے پیچیدہ مسائل اجاگر کرنے کی بجائے اپنے اندر کے جذبات کے اچھلتے ہوئے طوفان کی بات کی—اس تحریک نے انسان کی سوچ سے زیادہ اس کے دل کی بات اجاگر کرنے کی کوشش کی—یہ تحریک کلاسیک تحریک کا ردعمل تھی جن کے نزدیک دل کے ہاتھوں چلنے والا انسان پاگل ہوتا ہے اور وہ جذبات کی شدت کو ایک بیماری تصور کرتے تھے—ان کے نزدیک صرف اور صرف عقل ہی انسانی جسم پر مختیار کل ہے—

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی شاعرِ انقلاب کے نام سے مشہور ہوئے-ان کا اصل نام شبیر حسن خان تھا جو 5 دسمبر 1898ء کو ملیح آباد اتر پردیش میں پیدا ہوئے-ان کے آباواجداد افغانستان سے ہندستان آئے تھے—ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی— 1925ء میں حیدر آباد چلے گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ ترجمہ میں ملازمت اختیار کی-ابتدا سے ہی طبیعت میں جولانی اور ولولہ تھا اور فطرت سے بے پناہ لگاو تھا—انہوں نے اشعار کے ذریعے فطرت کی منظر کشی کی-طبیعت میں شدت پسندی کی وجہ سے نوکری سے برطرف کر دیئے گئے—اس کے بعد "کلیم" نام کا رسالہ نکالا جس میں برطانوی سامراجیت کے خلاف کھل کر مضامین لکھے اور اس طرح تحریک آزادی کے سرگرم رکن بن گئے-انگریز حکومت کے خلاف لکھی جانے والی نظموں کی وجہ سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور یہی طرزِ سخن انہیں شاعرِ انقلاب کا درجہ دلانے میں کامیاب ہوا-

بقول حسن[۵]:

"جوش کی رومانویت ان کی عشقیہ اور انقلابی شاعری دونوں میں نمایاں ہے۔عشق میں وہ جذبات کی پرستش تک کے
قائل ہیں—عشق ان کے نزدیک ایسا ماورائی لمس ہے جو صرف عاشق ہی کو انسان نہیں بنا دیتا بلکہ محبوب کو بھی مادی
آلودگی سے بلند کر دیتا ہے-"

جوش ملیح آبادی کی رومانیت میں جذبے کا طوفانی ابال بہت اہمیت رکھتا ہے—ان کے ابتدائی مجموعہ کلام "روحِ ادب" میں یہ رومانوی سوچ تخیل کے حسن اور اظہار کی بے تکلفی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے— "روحِ ادب" کے بعد جوش کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آئے ہیں جن میں ہجانی کیفیت اور سیمابی اضطراب شدید تر ہوتا جاتا ہے-ان کی رومانیت کا ایک اہم پہلو احساسِ حسن کی صورت میں بھی نظر آتا ہے—وہ جمالِ فطرت کے نئے نگینوں کو بیرونی سطح پر اجاگر کرتا ہے—بعض نقادوں کے مطابق وہ بیک وقت شاعرِ شباب بھی ہیں اور شاعرِ انقلاب بھی-جوش نے انسان کے اندر کے طوفان کو بیرونی راہ دکھائی—جوش کا رومانیت کا دوسرا اہم نقطہ جمالیات ہے اور اس تناظر میں جوش خالقِ جمال کی بجائے ثناخواں جمال کی صورت میں سامنے آتے ہیں—جوش کی رومانی نظموں میں انسان کی اندر کی گہرائی کی بجائے خارج کے حسن کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے—جوش کی جمال پسندی نسوانی حسن، مناظر فطرت اور رعنائی شباب کے مختلف زاویوں سے انعکاس کرتی ہے—یہ ایک حقیقت ہے کہ کہ جوش کو جذبہ اور احساس پر عبور حاصل تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے داخل کے ساتھ رابطہ مضبوط نہ کر سکے اور اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی بجائے خارجی عوامل سے زندگی کو متحرک رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے—ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مایوسی پر غلبہ پائیں—جوش کا ایک المیہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے تشبیہات، تراکیب اور مترادفات کے ساتھ خیالات کی وادی کے ارد گرد کوہ ہمالہ چن دیا—انہوں نے الفاظ کے ساتھ کافی حد تک انصاف کیا ہے لیکن بعض اوقات ان کے خیالات اور تخیلات ان کے الفاظ کا بوجھ برداشت نہ کر سکے-

دراصل جوش امن اور انسانیت کے شاعر تھے اور ہر طرح کی آزادی کے علمبردار تھے—انھوں نے محنت کش عوام میں زندگی کے حقیقی مفہوم کو تلاش کیا اور کسان، محنت کش عورتوں میں جن کی جو تصویر نظر آئی اس نے جوش میں رومانیت کا گہرا اثر چھوڑا—جہاں تک جوش کی زبان کا تعلق ہے انہیں الفاظ کا جادو گر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا—ان کی شہرہ آفاق نظموں میں شکست زندہ کا

خواب، کسان، وطن، البیلی صبح، ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب، خاتون مشرق، حسن اور مزدوری اور مفلس وغیرہ سرِ فہرست ہیں—انہوں نے غزل، مرثیہ، اور رباعی میں طبع آزمائی کی— انہوں نے مولویوں کی مذہبی ریاکاری کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ان کی اخلاقی پستی کی سخت مزمت کی۔

جوش مذہبی شدت پسندی کو ناپسند کرتے تھے اور انسانی عظمت کے بہت بڑے علمبردار ے تھے—سماج میں انسانی اقدار کی پامالی نے جوش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا—ملک کی آزادی کے بعد سماجی اخلاقیات میں جو گراوٹ آئی اس نے جوش کی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے—جوش اپنے مزاج کے مطابق سماج سے کبھی بھی مطابقت نہ رکھ سکے—نہرو کی قیادت میں رہے کر ہندوستان میں کچھ نہ کچھ سکون مل سکتا تھا مگر اپنی طبیعت کی بے چینی کی وجہ سے ہندوستان کو چھوڑا اور 1956 میں پاکستان کی شہریت حاصل کرلی اور زندگی کے آخری ایام بے چینی اور کسمپرسی کی حالت میں گزارتے ہوئے 22 فروری ۱۹۸۲ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

عبدالمجید عدم

عبدالمجید عدم نے ۱۰ اپریل ۱۹۱۰ء کو گجرانوالہ کے گاوں تلونڈی موسی میں آنکھ کھولی۔ابتدائی تعلیم گھر، میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور اور ایف۔اے پرائیویٹ کرنے کے بعد ملٹری اکاونٹس میں ملازمت اختیار کرلی—دس سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۳۹ء میں عراق جا کر ایک عراقی لڑکی سے شادی کرلی۔۱۹۴۱ء میں ہندوستان آگئے اور ایس—اے—ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ملٹری اکاونٹس پر پھر بحال ہوگئے—قیام پاکستان کے بعد آپ کا تبادلہ راولپنڈی کر دیا گیا۔۱۹۶۶ء میں اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔عدم نے اردو ادب میں اس وقت آنکھ کھولی جب اردو شاعری کے افق پر اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے چمکتے دمکتے ستارے موجود تھے—عدم نے انہی کی طرز پر رومانوی شاعری کی اور دوامِ عروج حاصل کیا—یہ بھی عام ہے کہ عدم حد سے زیادہ زود گو شاعر تھے—جب ان کے پاس شراب خریدنے کے لیے پیسے ختم ہو جاتے تو فوراً نئی غزل لکھ کر اپنے پبلشر کو دے کر ایڈوانس معاوضہ لے آتے تھے—عدم کی شاعری میں ہلکا ہلکا سوز بھی ہے اور عشق و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے—

عدم[۶] کے تمام کلام میں محبت، عشق اور جذبات کی شدید رو نظر آتی ہے:

"میں تیرے زلف و رخ پہ جو اتنا نثار ہوں
خلاق دلفریبی لیل و نہار ہوں
پڑھ کر جواب خط ترا محسوس یوں ہوا
اس سمت بھی میں آپ ہی نامہ نگار ہوں"

انہوں نے بھی اردو ادب میں موجود روایتی موضوعات گل و بلبل، خم و گیسو، شیشہ و سنگ اور شمع و پروانہ کا بے دریغ استعمال کیا ہے—ان روایتی موضوعات کے باوجود عدم نے اپنے سامعین کو ایک نیا ذائقہ ضرور دیا ہے۔وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور شاعری کی ہر صنف پر دسترس رکھتے تھے۔مگر ان کی اصل پہچان غزل اور رباعی بنی۔ان کی شاعری کے بے شمار مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں زلف پریشاں، رم آہو، نقش دوام، خرابات، گل ناز، گردش جام، جنس گراں، عکس جام، آب رواں، آب زر، شہر فرہاد، ساز و سلاف، سرو سمن، قصر شیریں، نگار خانہ زیر لب، شاعر خوباں، اور صنم کدہ کے نام قابل ذکر ہیں۔درانی[۷] دیگر شعرا سے موازنہ کرتے ہوئے عبدالحمید عدم کے بارے میں یوں گویا ہیں—

"عدم ایک خالص، ایک سچا شاعر ہے—اس کی شاعری خالص اور سچی شاعری ہے— "

عدم کا پہلا مجموعہ "نقشِ دوام" تقلیدی نظم نگاری کی عمدہ مثال ہے—لیکن جلد ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں نظم کی بجائے غزل میں طبع آزمائی کرنی چاہیے—کیونکہ غزل ان کی طبیعت سے مطابقت رکھتی تھی۔اگرچہ انہوں نے دوسری اصناف میں تھوڑا بہت ضرور لکھا—لیکن ان کا اصل میدان غزل ہی رہا—عدم نے غزل میں کوئی نئے موضوعات کا انتخاب نہیں کیا بلکہ پہلے سے موجود موضوعات پر انفرادی انداز میں شاعری کی۔ان کے غزل کے مجموعوں کی تفصیل اگرچہ بہت لمبی ہے پھر بھی انہوں نے اپنی شاعری میں غزل کے ساتھ انصاف کیا ہے—ان کے غزل کے مجموعوں کی ترتیب کچھ یوں ہے—

| نام مجموعہ | سال |
|---|---|
| ۱۔نقش دوام | ۱۹۳۴ |
| ۲۔خرابات | ۱۹۴۹ |
| ۳۔زلف پریشان | ۱۹۵۰ غزلیات |
| ۴۔گردش جام | ۱۹۵۲ غزلیات |
| ۵۔مکتب عشق | ۱۹۵۴ غزلیات |
| ۶۔ساز و ہدف | ۱۹۵۵ غزلیات |
| ۷۔ | پیچ و خم |

۱۹۵۶ غزلوں کے علاوہ کچھ نظمیں بھی شامل ہیں


CC BY

۸-قول وقرار ۱۹۵۶غزلیات

۹-شہرِ فرہاد ۱۹۵۶غزلیات

۱۰-قصرِ شیریں ۱۹۵۶غزلیات

۱۱-گلنار ۱۹۵۷غزلیات

۱۲-بطے ۱۹۵۷غزلیات

۱۳-شہرِ خوباں ۱۹۵۷

۱۴-نوکِ زباں ۱۹۵۷

۱۵-آبِ زمزم ۱۹۵۹

۱۶-خم ابرو ۱۹۵۹

۱۷-عکسِ جام ۱۹۵۹

۱۸-داستانِ ہیر ۱۹۵۹

۱۹-باغ وبہار ۱۹۶۰

۲۰-دو جام

۱۹۶۰

۲۱-درد ودرماں ۱۹۶۰

۲۲-رنگ وآہنگ ۱۹۶۰

۲۳-بربط وجام ۱۹۶۲

۲۴-نصابِ دل ۱۹۶۴

۲۵-بالِ ہما ۱۹۶۴

۲۶-جنسِ گراں ۱۹۶۵

۲۷-رمِ آہو ۱۹۶۶

۲۸-نشانِ راہ ۱۹۶۹

۲۹-آبِ زر ۱۹۷۱

۳۰-آبِ رواں ۱۹۷۲

۳۱-ذکرِ یار ۱۹۷۲

۳۲-رسوائیِ نقاب ۱۹۷۲

۳۳-جھوٹ سچ ۱۹۷۲

۳۴-سرو سمن ۱۹۷۴

۳۵-سندر بن ۱۹۷۴

۳۶-زکاتِ حسن ۱۹۷۴

۳۷-دستورِ وفا ۱۹۷۵

۳۸-خم کدہ ۱۹۷۵

۳۹-چارہِ درد ۱۹۷۵

۴۰-بہتے موتی ۱۹۷۵

۴۱-دولت بیدار ۱۹۷۶

۴۲-جوئے شیر ۱۹۷۶

۴۳-چاکِ پیراہن ۱۹۷۷



CC BY

۴۴-نگار خانہ ۱۹۷۸

۴۵-دردِ محبت ۱۹۸۰

۴۶-دہانِ خم ۱۹۸۰

۴۷-مورتیں ۱۹۸۴

۴۸-نادانیاں ۱۹۸۵

اختر شیرانی

داود خان اختر شیرانی ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں وفات پائی-انکی شاعری میں شباب، رومان، اور فطرت پرستی پائی جاتی ہے—اختر شیرانی کے نزدیک حسن یا تو عورت میں پایا جاتا ہے یا پھر فطرت میں-اردو ادب کی تاریخ میں اختر شیرانی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں اپنی محبوباوں کے نام بے خوف اور کھلم کھلا بیان کیے ہیں—

بقول تونکی[۸]:

"شاعرِ حسن و جوانی حضرت اختر شیرانی بلاشبہ ایک بہترین رومانی شاعر تھے۔اپنے ہمعصر شعرا میں وہ منفرد و ممتاز ہی نہیں تھے بلکہ مقبول ترین شاعر تھے اور ان کی شاعری نے شہرت کے پر پرواز نکال کر بام عروج کا چھو لیا تھا—"

وہ مادی اور کثیف دنیا سے دور محبت کی اس وادی میں پہنچ جانا چاہتے ہیں جہاں روز مرہ زندگی کی کشافتیں اور رکاوٹیں نہ ہوں—جہاں نور ہو، چاندنی ہو، نشہ ہو، شراب ہو، رنگ و بو ہو، بہار ہو، فطرت کا حسن ہو، چاندنی ہو، پھول ہوں، فضا میں سرور و مستی کی طغیانی ہو اور محبت کرنے کی ہر طرح کی آزادی ہو—اختر شیرانی کا عشق عنفوانِ شباب کا عشق ہے جس میں وجد و کیف بھی ہے جوش و جذبہ بھی ہے، شعر و نغمہ بھی ہے اور گرمی و شدت بھی ہے-یوں تو اختر شیرانی کی جنت سلمی، ریحانہ اور عذرا کی آغوش میں ہے لیکن یہ جنت فطرت کے بغیر نامکمل ہے—انہیں فطرت سے لگاؤ کے حوالے سے ورڈزورتھ کا ہم پلہ شاعر کہا جا سکتا ہے—انہیں بادل، بہار، برسات، بہتی ندیاں، چہچہاتے پرندے اور چاندنی رات کے پر کیف مناظر شدید متاثر کرتے ہیں—اختر شیرانی اپنے دوسرے ہم عصر شاعروں کی طرح ایک رومانوی شاعر تھے-تمام رومانوی شاعر اپنے شخصی میلانات کی وجہ سے ایک ہی دائرہ کار میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں—کسی کو بادِ نسیم میں کیف ملتا ہے تو کوئی شفق کی رنگینوں میں کھو جاتا ہے—یہی چیز کسی کو ورڈزورتھ، کسی کو شیلے اور کسی کو کیٹس کے نقطہ نظر میں بھی محسوس ہوتی ہے-یہ سب رومانوی شاعر ہیں—تمام رومانوی شاعروں میں جو قدریں مشترک ہیں ان میں جمود کو توڑنا، تخیل کی مدد سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا، نئی دنیا کی جستجو، بھری بہار، محبوبہ کی آغوش میں مر جانے کی آرزو قابل ذکر ہیں-یہ خواہشات نت نئے انداز میں ہر رومانوی شاعر کے ہاں ملتی ہیں—اختر شیرانی کے ہاں یہ تمام عناصر یکجا ہو کر ملتے ہیں-انہوں نے تخیل سے حسن و شباب، سرفروشی و خود فراموشی اور امن و سکون کی ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے-

اختر شیرانی محبت و عشق کے نشے میں سرشار چناروں کی جانفزا چھاؤں میں حسن و عشق کے علاوہ بہاروں اور نظاروں کے گیت گاتے نظر آتے ہیں—ان کے نغموں میں جوش، حسن، زندگی، تڑپ، سوز، ترنم، روانی، شباب، مسرت، محبت و الفت اور حجان خیز کیفیات ہیں،-یہ نغمے ان کی روح کی گہرائیوں میں جنم لیتے ہیں اور خونِ جگر سے پرورش پاتے ہیں—ان کی شاعری میں سنہرے خوابوں کے دلکش نغمات ہیں-جن میں شعریت کے علاوہ موسیقیت کا عنصر غالب ہے-

اردو ادب میں رومانیت کی حقیقی پہچان اختر شیرانی ہی ہیں کیونکہ ان کا رومانیت کی طرف رجحان اور میلان واضح اور دل آویز ہے—اختر شیرانی کی شاعری میں حسن کی تلاش بے باک اور بے خوف ہے—حسن مناظر فطرت کا ہو یا عورت کا اس کے بیان میں اختر کا کوئی ثانی نہیں-

بقول سلام[۱]:

"اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا رنگ ڈھنگ اور آہنگ سب سے الگ ہے—انہوں نے شاعری میں کسی کا تتبع نہیں کیا اور نہ کسی کے انداز بیان سے اپنے اشعار کو متاثر کیا بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کی شاہراہ الگ سے منتخب کی اور اس میں ایسے سنگ میل قائم کیے کہ پیش روؤں کے لیے نئی راہیں استوار کیں۔"

عورت کی محبت اس کے نزدیک خاصہِ کائنات ہے-وہ روز مرہ زندگی کے معمولات اور یکسانیت کو رد کرتے ہیں اور اپنے لیے اپنی علیحدہ دنیا تعمیر کرتے ہیں—ان کی شاعری کا بنیادی وصف بہاروں، فطرت کے نظاروں کی دنیا، خلوص اور جذبات کی دنیا ہے-ورڈزورتھ ایک فطرت پرست شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں بادل، گھاس، ندیاں، سبزہ اور کوئل کثرت سے ملتے ہیں اور یہی خاصہ اردو رومانوی شاعر اختر شیرانی کا بھی ہے-بقول سلام[۱]:

"اختر شیرانی محض فطرت نگار ہی نہیں بلکہ بہت بڑے فطرت پسند بھی ہیں اور ان کی فطرت پسندی میں ان کا خلوص، محبت اور شوق شامل ہیں۔وہ فطرت سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔"

ان میں اور ورڈزورتھ میں جو ایک معمولی سا فرق ہے وہ یہ ہے کہ وہ فطرت کو استاد اور معلم کی طرح نہیں دیکھتا بلکہ بال بکھیرے نیلگوں پریوں کے حسیں پیکر میں دیکھتا ہے- بادل اس کے بکھرے ہوئے خواب ہیں۔شیرانی[۹] لکھتے ہیں:


CC BY

"اور بھٹکتی گھٹائیں اسے میگساروں کی یاد دلاتی ہیں
پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹائیں اس طرح"

اختر نے حسن و جمالیات کی صرف پرستش ہی نہیں کی بلکہ اس سے لطف اور سرور بھی حاصل کیا۔اختر کی رومانوی شاعری میں صرف ادا سی کا عنصر ہی غالب نہیں بلکہ رجائیت بھی اس کی شاعری کا اہم نقطہ ہے۔وہ ایک ماورائی سرمستی اور تخیل سے بھرپور مناظر کا پجاری ہے۔کیٹس کی طرح حسن ان کے لیے ایک جاودانی کیفیت ہے۔اختر کے کچھ اہم موضوعات میں اس دنیا سے دور کسی ایسی ہستی کی تلاش ہے جو ہر طرح کی دنیا و مافیا سے الگ ہو۔"اے عشق کہیں لے چل 'اس کی اہم نظم ہے ۔کیٹس بھی اس دنیا کی تلخیوں اور سختیوں سے نکل کر بلبل کی دنیا میں پناہ لینے کا خواہاں تھا اور یہی سوچ اختر کے ہاں بھی ملتی ہے۔وہ زندگی کی سختیوں اور بے جا پابندیوں کو برداشت کرنے کا عادی نہیں تھا جس کا نتیجہ بغاوت کے جذبات کا جنم لینا تھا۔

رومانوی شاعر اپنے آپ کو ایک گمراہ فرشتے کی طرح محسوس کرتا ہے جو بھوتوں کی دنیا میں مقید کر دیا گیا ہو۔اختر بھی اپنے آپ کو اس دنیا سے دور کہیں ایسی دنیا میں لے جانا چاہتے تھے جہاں کی دنیا اِس دنیا سے یکسر مختلف ہو۔اختر کا دوسرا اہم موضوع جو رومانیت کا خاص موضوع ہے وہ قوم پرستی اور وطنیت ہے۔تقریباً تمام رومانوی شعرا میں یہ جذبہ کار فرما ہے۔اختر کی مشہور نظمیں "میرا نھا جواں ہوگا"اور "اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا" میں تبدیلی اور انقلاب کی جھلک نظر آتی ہے۔اگرچہ یہاں پر اس کی خواہش اتنی شدید نہیں لیکن پھر بھی اس کی دھیمی سی آواز ضرور موجود ہے ۔"میرا نھا جواں ہوگا" نظم میں رومانوی معصومیت کی جھلک نظر آتی ہے۔اختر کے ہاں کوئی واضح سیاسی یا معاشرتی نظام کا تصور نہیں تھا۔وہ کسی کو بھی سیاسی غلامی کے خلاف نہیں اکساتے البتہ وہ خود سماجی بندھنوں اور روایتی رکاوٹوں کو ہر قدم پر ٹھکراتے ہیں۔وہ اپنی دنیا میں اتنے محو ہیں کہ ان کے پاس وقت نہیں کہ لوگوں کو نظام کے خلاف ابھاریں اور اصلاح کا راستہ بتائیں۔لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں وطن سے محبت کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے۔

جس طرح رومانیت کسی ایک بھیس میں نہیں رہ سکتی۔اس کی روح ہمیشہ بے چین رہتی ہے ۔کبھی رومانوی شاعر فطرت سے لگاؤ لگا کر اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے تو کبھی نئی راہوں پر چل کر اس دنیا سے فرار چاہتا ہے۔رومانیت کے کچھ پیروکار زبان و بیاں کے پرانے سانچوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں تو کچھ جذبات کے رو میں بہہ کر لازوال شاعری تخلیق کرتے ہیں۔اختر کے ہاں رومانیت کے تمام رجحانات اور میلانات فراوانی میں پائے جاتے ہیں۔ان کے ہاں ورڈزورتھ کی طرح فطرت سے لگاؤ بھی ہے شیلے کی طرح امید اور وطنیت کا جذبہ بھی ہے اور کیٹس کی طرح حسن کے بے باک جذبات بھی۔اختر کی شاعری کا محور محض عورت کی جسمانی خوبصورتی نہیں بلکہ اس کے نزدیک عورت ہر روپ میں خوبصورت ہے۔اختر کے وہ اشعار جو لطیف جذبات اور احساسات سے بھرپور ہیں ۔ان میں درد و کرب کی آہیں اور چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں۔شیرانی[۹] لکھتے ہیں:

"اے عشق ہمیں برباد نہ کر
ہم بھولے ہوں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم
تو اور ہمیں ناشاد نہ کر"

اختر کی شاعری میں شیلے، کیٹس اور بائرن کا رومینس اپنی پوری نفاست اور لطافت کے ساتھ ملتا ہے جو قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ان کی شاعری وجد آفریں بھی ہے اور مسحور کن بھی۔ورڈزورتھ کی لوسی کی طرح اختر کی ریحانہ، عذرا اور سلمٰی تصوراتی محبوبائیں ہیں۔ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔انہوں نے اپنے تخیل سے عشق و سرمستی اور پریوں کی ایک ایسی دنیا تخلیق کی جہاں صرف وہ خود ہی لطف حاصل کر سکتا تھا۔ان کے گیت رس بھرے گیت ہیں۔اس کے نغموں میں غزلیات کا عنصر غالب ہے جس میں وہ خود ڈوب کر بھی گیت گانے لگتے تھے۔شیرانی[۹] لکھتے ہیں:

"ترا ننھا سا قاصد، جو ترے خط لے کر آتا تھا
نہ تھا معلوم اسے، کس طرح کے پیغام لاتا تھا
سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں
اسے کیا علم ان رنگیں لفافوں میں چھپا کیا ہے"

کہا جاتا ہے اختر شیرانی اور اس کی محبوبہ سلمٰی نے بیسویں صدی کے نئے شاعروں کو حسن اور عشق کی نئی کسوٹی عطا کی۔لیکن بعد کا کوئی شاعر اختر کے مقام تک نہیں پہنچا۔کیونکہ شاعرِ رومان نے اپنے لیے کچھ اور ہی معیار متعین کیے تھے۔اختر کی سلمٰی کو اردو ادب میں وہ مقام ملا جو کسی اور شاعر کی محبوبہ کو حاصل نہیں ہوا۔دیگر شعرا رومانیت کو سطحی اور رسمی چیز سمجھتے ہیں لیکن اختر کے لیے وہ ان کا پورا وجود ہے۔یہ رومان انکی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔اس رومان کو آگے بڑھانے میں اختر کا خلوص، محبت اور لگن شامل ہے۔اگرچہ اس رومان میں کہیں کہیں ہمیں فرار کی جھلک نظر آتی ہے لیکن یہاں سپردگی فرار پر غالب ہے۔یہاں غم و الم کی بجائے خوشی اور شادمانی ہے۔اختر کے ہاں مایوسی کا عنصر غالب نہیں ہے اور ہر طرف امید کی کرنیں پھیلی ہوئی ہیں۔انہوں نے اپنی رومانوی شاعری کے ذریعے زندگی کی کڑی سے کڑی دھوپ کا مقابلہ کیا اور اپنے قاری کو چھاؤں تلاش کرنے کی دعوت دی۔اختر کی شاعری کا سب سے قوی اور غالب احساس حسن کا احساس ہے۔وہ حسن اسے سلمٰی کے گیتوں میں بھی نظر آتا ہے اور فطرت کی آغوش میں بھی۔انہوں نے دیہاتی منظر کا نقشہ جس طرح کھینچا ہے اس کی ایک جھلک ہمیں ان کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" میں نظر آتی ہے۔شیرانی[۹] لکھتے ہیں:

"او دیس سے آنے والے بتا

کیااب بھی وہاں بھی پگھٹ پر
پنہاریاں پانی بھرتی ہیں"

کیٹس اور ورڈزورتھ کی طرح انہوں نے پہاڑوں اور وادیوں میں موسیقی کی آواز سنی اور وہاں کے جھینگر کے ترانے سنے۔شیرانی[۹] لکھتے ہیں:

"اودیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں
گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں"

الغرض اختر کے ہاں فطرت کوئی غیر متحرک چیز نہیں بلکہ پوری آب وتاب کے ساتھ اور پورے ولولہ کے ساتھ ہمہ وقت متحرک قوت ہے جو زندگی کی تپتی دھوپ میں ایک سائباں کی مانند ہے۔

حفیظ جالندھری

ابوالاثر حفیظ جالندھری پاکستان کے قومی شاعر ہیں مگر انہیں ہندوستان میں بھی پذیرائی حاصل تھی۔تقسیم ہند سے پہلے ان کی ادبی حلقوں میں پہچان بن چکی تھی۔ان کی سب سے بڑی شناخت "شاہنامہ اسلام" ہے—جو اسلامی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا بہترین شعری حوالہ ہے۔انہوں نے جس انداز میں عظیم اور ارفع ہستیوں کی شعری پیکر تراشی کی اسی بناپر ان کی یہ تخلیق اپنی انفرادی نوعیت کے لحاظ سے ایک اعلیٰ تخلیق قرار دی گئی ہے۔حفیظ جالندھری کی شاعری کی تیسری بڑی خاصیت غنایت اور موسیقیت تھی—وہ خود بھی ایک اچھے مترنم تھے۔اس لیے انہوں نے الفاظ کے چناو میں خاص خیال رکھا جو غنایت کے سانچے میں پورے اترتے تھے۔وہ ایک اچھے گیت نگار تھے اور دوسری جنگ عظیم کے دور میں فوج کے لیے گیت لکھے۔جس وجہ سے آج بھی ان کی پہچان "ابھی تو میں جوان ہوں" کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ان کے گیت آج بھی سامعین کے دل میں زندہ جاوید ہیں۔

ان تمام حقیقتوں کے باوجود ہم بلاشبہ حفیظ کو ایک غزل گو شاعر کہہ سکتے ہیں اور وہ خود بھی ایسا کہلوانا پسند کرتے تھے—انہوں نے غزل میں نت نئے تجربات کیے۔ان کی غزلوں کی زبان سلیس اور موضوع اردگرد کے عام واقعات ہیں—انہوں نے غزل کو زندگی کی حقیقتوں کے قریب تر کر دیا—ان تمام رومانوی شاعروں کی طرح ان کے ہاں بھی روایت سے بغاوت ملتی ہے—ان کے چند اشعار آج کے حالات کی بھی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں—جالندھری[۱۰] کا کہنا ہے:

"دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی"

حفیظ جالندھری پر کیف اردو ادب کے ایک عظیم شاعر ہیں۔انہوں نے اردو شاعری کو جو عطا کیا وہ ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔حفیظ جالندھری ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو لاہور میں جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

ان کی شعری تخلیقات میں چار جلدوں میں شاہنامہ اسلام، نغمہ زار، سوز وساز، تلخابہ شیریں اور چراغ سحر سرفہرست ہیں—ان کی شعر وادب کی کائنات چھ دہائیوں پر محیط ہے اور جالندھری[۱۰] یہ کہنے میں حق بجانب بھی ہیں:

"تشکیل وتکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں"

اردو میں رومانوی تحریک کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا یعنی انگلستان کی رومانوی تحریک کے تقریباً سو سال بعد۔اردو میں اس تحریک کے آغاز کے لیے راہ آہستہ آہستہ ہموار ہوئی اور اس تحریک کو کئی غیر متوقع وسائل سے مدد بھی ملی۔حالات وواقعات نے بھی اس کی مقبولیت کی راہ ہموار کی۔اس سلسلے میں ٹیگور کی ماورائیت، اقبال کی روایت شکنی اور ابوالکلام کی انفرادیت خاص طور پر قابل توجہ ہیں—

اردو میں رومانوی تحریک کے شروع ہونے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر میں کالجوں اور سکولوں میں جس قسم کا نصاب پڑھایا جاتا تھا وہ بیشتر رومانوی ادیبوں اور شاعروں کی تحریر پر مشتمل تھا—جب یہاں کے لوگوں نے ان ادیبوں اور شاعروں کو پڑھا تو انہیں خیال آیا کہ درحقیقت ادب تو یہ ہے کیونکہ ان دنوں ہمارے ہاں سرسید اور ان کے رفقائے کار کا ادب سامنے تھا جس میں عقل کی تلخی اور خشکی تھی مگر اس رومانوی ادب میں جذبہ اور تخیل کا دخل تھا۔اس لیے لوگوں نے سوچا کہ ادب وہ نہیں ہونا چاہیے جس میں جذبہ اور تخیل کو پس پشت ڈال کر عقلیت کا دور دورہ ہو۔اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مشرق کی زمین رومانوی ہے۔یہاں حقیقت پسندی مقبول نہیں ہو سکتی۔یہاں کے لوگ فطرتاً جذباتی واقع ہوئے ہیں۔چنانچہ یہاں کی سرزمین رومانوی ادب کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے اردو ادب میں رومانوی تحریک سرسید کے خلاف ردعمل کے طور پر سامنے آتی ہے—سرسید نے عقلیت، مادیت اور حقائق نگاری پر بہت زور دیا اور فرد کی زندگی کے جذباتی اور رومانوی پہلوؤں کو یکسر نظرانداز کر دیا۔کچھ عرصے تک یہ سکہ چلتا رہا۔لیکن انگریزی کے رومانوی ادیبوں اور خاص طور پر شاعروں کے زیر اثر سرسید کے عقلی اور مقصدی ادب کے خلاف رومانوی ادیبوں نے شدید احتجاج کیا۔اور یوں شعر وادب کی دنیا میں نئی راہوں کی نشان دہی کی گئی۔

رومانوی تحریک کے عاملوں نے دنیا اور مافیا سے الگ اپنی دنیا خود بسائی اور اپنے الگ فن بنائے۔یہ سب جدا جدا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ان رومانیوں نے جدید شہری زندگی کی بجائے فطری زندگی کو موضوع بنایا۔ان فنکاروں کے کردار تہذیب یافتہ نہیں بلکہ فطری انسان ہیں جن پر تہذیب کا پرتو بھی نہیں چڑھا۔اس تحریک میں طنز ومزاح ہے۔تاہم حسن ومحبت، انسانی ہمدردی، غم ودرد،


CC BY

سنجیدہ فکر، غم دوراں، نئی امنگیں اور جنت کے خواب ہر طرف نظر آتے ہیں-ان کے ہاں عجائبات کی دنیا سامنے آتی ہے جو جذبات سے دل کو معمور کرتی ہے اور جذباتی نقطہ نظر سے پوری کائنات کو دیکھنے پر مجبور کرتی ہے-رومانوی فکر میں امید حوصلہ بڑھاتی ہے اور بعض اوقات امید شکست کے مناظر بھی پیش کرتی ہے-زبان فطری ہے-عام الفاظ، نئی تراکیب، انفرادی تخیلات اور تصورات رومانوی طرز کی اہم صفات ہیں-ان کے ہاں عروض کا ایک ہی اصول ہے کہ بحروں اور بندوں کو جذبات کے لحاظ سے شکل دی جائے-یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کئی قسم کی جدتیں وجود میں آئی ہیں-ہر نیا ادیب اور شاعر جدتِ طبع کی بنا پر کسی نہ کسی اہم عروضی کارنامے کا موجد ہے-ان حالات میں رومانی تحریک پروان چڑھی—

حفیظ جالندھری نہ صرف ایک رومانوی شاعر ہیں بلکہ ملی وحدت کی علامت ہیں—انہوں نے محبت اور فطرت کے علاوہ اسلام کے موضوعات پر عظیم شاعری کی ہے—ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ شاہنامہ اسلام ہے جس کو اس نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے—وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مصلح اور رحم دل مسلمان بھی ہیں—شاہنامہ اسلام کی اشاعت کے وقت مسلمانوں کی حالت ابتر تھی-وہ زوال کا شکار تھے—شاہنامہ صرف اسلام کے ظہور، نبی ﷺ کے غزوات اور کفار کے ظلم وستم کا بیان ہی نہیں بلکہ یہ ایک اخلاق نامہ ہے-اور عالم انسانیت کے لیے ایک ایسا سبق ہے کہ اگر آج بھی مسلمان حضور اکرم ﷺ کے نقش قدم اور اسوہ حسنہ پر عمل کریں تو وہ ایک تابناک مستقبل کی امید رکھ سکتے ہیں—حفیظ نے شاعری کے ذریعے واقعات کی منظر کشی کی ہے—انہوں نے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ تاریخ پر ان کی گرفت مضبوط ہے-اور انہوں نے تاریخ کو باریک بینی سے پڑھا ہے اور انہی تاریخی واقعات کو اپنے شعروں میں پرو دیا ہے-ان کا اندازِ بیان انتہائی سادہ، سلیس اور پر وقار ہے—انہیں اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور ہندی پر دسترس حاصل تھی-حفیظ کے اظہار کا انداز، جذبوں کی شدت اور انداز بیاں ایسا دل آفریں ہے کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے چلے آتے ہیں—وہ ایسا قافیہ بیان کرتے ہیں جس کو پڑھ کر قاری شدر رہ جاتا ہے کہ الفاظ کو یوں بھی برتا جا سکتا ہے—اردو ادب کے عظیم شاعر عمر زمان نے انہیں شاعرِ پاکستان کہا ہے-لیکن اکثر ناقدین کی نظر میں وہ شاعرِ اسلام ہیں—

حفیظ ہر دور اور ہر عمر کے شاعر ہیں-ان کی نظمیں بچوں کے لیے بھی ہیں اور ان کا پیغام جوانوں کے لیے بھی ہے اور انہوں نے بوڑھوں سے بھی خطاب کیا ہے-ان کی نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" ہمت اور حوصلے کا پیغام دیتی ہے—یہاں ہمیں تخیل کی پرواز نظر آتی ہے—حفیظ دیکھا جائے تو عمر میں جوان ہے مگر شاعری میں وہ بوڑھوں کی طف میں کھڑا ہے—شدت جوانی میں انہوں نے بسنت اور بہار پر ایسی نظمیں لکھیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر رنگین مزاجی کی تمام منازل طے کر چکا ہے—فطرت نگاری پر حفیظ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

بقول جالندھری[11]:

"دو جانب تا حد نظر پھیلے ہوئے بن کے نظارے
کوہ و من کے سنگ و شجر کے دشت و چمن کے نظارے
اور دو جانب حور و قصور خلد و عدن کے نظارے
یہ بنجارہ پربت—یہ فردوس دکن کے نظارے"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ بیتی لکھ رہا ہے—شاعری میں جس طرح کے لطف اور مزے کی بات کی گئی ہے لگتا نہیں کہ زمانے نے انہیں ایسی مہلت دی ہو کہ انہوں نے دنیا کی رنگینیوں کو قریب سے دیکھا ہو اور ان کا لطف لیا ہو—ان کی زندگی کا بیشتر حصہ پڑھنے، لکھنے میں گزر گیا اور انہیں کسی قسم کی فراغت نصیب نہ ہو سکی—کسی اخبار یا رسالے کے لیے اگر کچھ لکھا بھی سہی تو اس کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر—اگر کوئی کتاب بھی لکھ ڈالی تو وہ بھی سستے داموں کسی نے خرید لی-حفیظ نے جس روز سے شعر لکھنا شروع کیے پھر لکھتے ہی چلے گئے-ان کی نظموں کا مجموعہ "نغمہ زار" میں سچی ہمدردی اور قدرتی شاعری کا میلان نظر آتا ہے—شاہنامہ اسلام ان کا مقصد حیات بن چکا تھا—

شاہنامہ اسلام حفیظ جالندھری کا عالم اسلام پر ایک احسان ہے—جس انداز میں انہوں نے رسول پاک ﷺ کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اس کے لیے وہ خراج عقیدت کے مستحق ہیں—حفیظ کی منظر نگاری اپنی مثال آپ ہے—اس ضمن میں انہیں اپنے ہم عصر شعرا پر برتری حاصل ہے—انہوں نے واقعات کو جس انداز مین بیان کیا ہے لگتا ہے کہ قاری وہاں پر خود موجود ہو اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ تمام مناظر دیکھ رہا ہو-یہ خاصہ صرف حفیظ کا ہی ہے کہ انہوں نے شدت جذبات اور عظمت خیالات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے-

حفیظ ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ اعلی پائے کے نثر نگار بھی ہیں—نثر میں انہوں نے درجنوں تصانیف تخلیق کیں—"نثرانے" اور "چیونٹی نامہ" ان کی مشہور کتابیں ہیں-انہوں نے بچوں کے لیے بھی درجنوں نظمیں لکھیں-کہا جاتا ہے کہ حفیظ کا اردو ادب میں نمودار ہونا ایک دھماکے کی مانند تھا اور یہی دھماکہ اپنے دامن میں اردو شاعری کے لیے کچھ نئے پھول اور کچھ نئی کلیاں لایا—

ان کا مجموعہ کلام "نغمہِ زار" ان کا شباب ہے اور ان کے شباب کی بہت سی خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں—حفیظ کے ادبی اور شعری کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے—اردو، انگریزی اور فارسی کے کسی بھی مشہور شاعر کے مقابلے میں وہ زیادہ متنوع ہیں—رومانوی شعرا کی طرح انہوں نے روایت سے بغاوت کی اور نظم میں جدت طرازی کی ترح ڈالی-اردو شاعری میں پہلی بار کسی شاعر نے اپنی دھرتی کا رنگ روپ دکھایا ہے—باقی شعرا نے تصوراتی واقعات اور تخیلاتی مناظر کا سہارا لیا لیکن حفیظ نے اسلام کے مستند واقعات کو شاعری کا رنگ دیا—ان کی شاعری میں قومی اور ملی مقاصد ہمیشہ سر فہرست رہے-۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف ایک نظم لکھنے اور اسے جلسہ عام میں پڑھنے کی پاداش میں گرفتار کر لیے گئے-تقریباً ۳ ماہ جیل میں رہے—

حفیظ نے ملی تشخص کے ساتھ ساتھ عشق رومان اور فطرت پر خوبصورت شاعری کی—رومانوی تحریک کے اصول وضوابط کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی اور اپنی ادبی زبان کو ہر قسم کی ملمع کاری سے پاک رکھا—سہل زبان ہونے کی وجہ سے وہ عوامی شاعر بن گئے اور ان کی شاعری عام سے قاری کے لیے بھی قابل فہم ہے—حفیظ کی شاعری میں انفرادیت ہے—کہیں کہیں اس میں اپنے دور کے ہم عصروں کا اثر بھی نظر آتا ہے—لیکن انہیں ایک منفرد اور آزاد لب ولہجہ کا شاعر کہا جا سکتا ہے—حفیظ نے انتہائی سادہ اور رواں بحروں کا استعمال کیا—اور کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نثر کے زیادہ قریب ہو جاتی ہے-


CC BY

اردو شاعری اور رومانیت

اردو شاعری کا جائزہ لینے پر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ رومانیت کے عناصر اردو شاعری میں موجود تھے۔ابتدا میں یہ عناصر بکھرے ہوئے تھے اور یہ کسی ایسے منظم طرز احساس سے نہیں پھوٹے تھے جو شاعر کی شخصیت کا حصہ بن سکیں۔بیسویں صدی سے پہلے اردو شاعری پر غزل کا اثر زیادہ تھا۔غزل نے اشیا اور ماحول کو نسبتاً فاصلے سے دیکھا تھا۔اس لیے دھندلا پن پیدا ہو گیا۔چنانچہ زندگی کی وہ انفرایت جو شخصی مزاج کے آئینے سے منعکس ہو کر فن میں ظاہر ئی ہے ابھر کر سامنے نہ آسکی۔یہ خدمت بیسویں صدی میں نظم کی صنف نے سرانجام دی اور اردو نظم ایک سطح پر تو فرد کے نمایاں ہونے کی خواہش سے تعبیر ہوتی ہے۔لیکن دوسری سطح پر اس میں غزل کی کلاسیکیت کے خلاف بغاوت کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جب اردو شاعری میں نظم کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا تو غزل کی معنوی وسعت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔شاعری کے نئے رجحانات مختلف صورتوں میں غزل میں بھی شامل ہونے لگے۔اس لیے یہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ نظم نے اردو غزل کے اوصاف کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اسے نئے آفاق سے متعارف اور روشناس کرانے میں مدد کی۔دوسری جانب نظم کے فروغ نے شعرا کو اپنے خارج کی جزئیات میں جھانکنے اور زندگی کے نقوش اجاگر کرنے کی طرف توجہ دلائی۔یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ "انجمن پنجاب لاہور" میں ان دونوں میں واضح حد موجود تھی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فطرت اور شاعر کے درمیان ایک خلا پیدا ہوا۔شاعر مناظر فطرت کی ثناخوانی تو کرنے لگا لیکن اس کی روح فطرت کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوئی۔شاعری میں حفیظ نے انسانی احساسات کو فطرت کے پراسرار عمل سے پہلی مرتبہ متعارف کروایا۔اور اس کی پہنائیوں میں کھو جانے کی بجائے فطرت کی منہ زور قوت سے زندگی کو تحریک اور تازگی عطا کی۔

اردو شاعری پر حفیظ کے اثرات بے پناہ ہیں۔اس عہد کے بیشتر شعرا جنھوں نے انگریزی اداروں میں تعلیم پائی تھی اور جو جوانی کی منزل سے گزر رہے تھے حفیظ کی رومانیت سے اتنا اثر لیا کہ ان کی شاعری میں پرواز کی عمودی جہت، فروغ تمنا، طغیان مسرت، انتہائی یاس اور ذہنی پیش افتادگی کی صورت میں نمایاں دکھائی دینے لگی۔ان شعرا نے نہ صرف فطرت کے حسن کو اپنا موضوع بنایا بلکہ اس کا رشتہ اپنے داخل سے بھی قائم کیا۔حفیظ نے رومانیت کے جس زاویئے کی ترویج کی ہے اس کے اثرات جدید اردو نظم کی تشکیلی دور میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

بقول سدید[۲]:

> "اردو رومانوی شعرا میں حفیظ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے زندگی کے مادی
> ذرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اعتراف کیا ہے یہاں کی
> شاعری کی تخلیق میں غفوان شباب کی بے فکری، خودی، لطافت، نزاکت، خوشی
> حاصل ہو جانے پر خوشی رنج و غم سے دوچار ہو جانے پر رنج و غم۔مسکراہٹ
> اور آنسو، کبھی طلب و تلاش، کبھی استغنا اور انانیت سب شامل تھا۔"

۔"تلخابہ شیریں" میں حفیظ جالندھری نے اقبال، حالی اور ٹیگور کی تعریف بھی کی ہے اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ وہ ان تین مشرقی شعرا سے متاثر تھے۔حفیظ کی شاعری کے بیشتر ماخذات بھی مشرقی ہیں۔ان کی رومانیت کو مشرق پسندی کے اس رجحان کا ایک زاویہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی ترقی میں مہدی آفادی، سجاد انصاری، اور ڈاکٹر بجنوری نے اہم حصہ لیا۔

حفیظ کی رومانیت ان معصوم حیرتوں سے عبارت ہے جو ان کے دل میں گردوپیش کے حسن کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ان کی نظموں میں فطرت کا جمال ایک نغمۂ سرمدی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔وہ فطرت کی آغوش میں سر رکھ کر ان حیات آفریں لوریوں کو سنتے ہیں اور فطرت کے نغمے سے قلب و روح کو تازگی عطا کرتے ہیں۔چنانچہ حفیظ کے شباب کی سرکشی، استغنا اور انانیت در حقیقت ان کے رومانی مزاج کا حصہ ہے۔

حفیظ کی رومانیت کا بہترین اظہار ان کی غنائیت میں ہوتا ہے۔انہوں نے بحروں کے انتخاب اور الفاظ کی ترتیب سے آہنگ نغمہ پیدا کیا اور منظر کی ہر کیفیت کو بھی نظم کے بند میں شامل کیا۔ان کی رومانیت کا ایک اور زاویہ ارض وطن کی محبت کی صورت میں نمودار نظر ہوتا ہے۔پطرس بخاری نے لکھا تھا کہ حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس کی جھلک پر فدا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حفیظ نے وطن کی سرزمین کی رعنائیوں سے مسرت تخلیق کی ہے۔حفیظ نے جس خوبصورتی سے برصغیر کے رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں اور مناظر فطرت سے والہانہ وابستگی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے انہیں رومانوی تحریک کا اہم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

جوش نے خارجی سطح پر فرد کو طلاطم سے آگاہ کیا۔اسے بڑھتی ہوئی ہلچل اور بے چینی اور طوفان بننے پر تیار کیا اور پرانی دیواروں کو گرا دینے کا مشورہ دیا۔لیکن جوش نے نئی دیواروں کی تعمیر کے لیے کوئی معقول راہِ عمل تجویز نہیں کی۔جوش کا یہ عمل رومانیت ہی کا نتیجہ ہے۔پھر بھی اس میں تعمیر کی بہ نسبت تخریب کاری زیادہ ہے۔جذبہ اور احساس پر قابو پانے کے باوجود جوش کا اپنے داخل کے ساتھ کوئی مضبوط رابطہ نہیں رہتا اور وہ اپنی ذات میں غوطہ لگانے کی بجائے خارجی عوامل سے زندگی کو متحرک رکھنے اور مایوسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس طرح یہ رومانی عمل ہے۔اس قسم کی رومانیت میں شاعری بیانیہ بن جاتی ہے اور اس کی سطحیت واضح ہوتی ہے۔جوش کا المیہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی پر جلال آواز سے گھن گرج پیدا کی۔چھوٹے سے خیال کی وادی کے داخل میں جھانکنے کی کوشش میں تخیلی زاویہ گہری کھدائی کے باوجود واضح نہ ہو سکا اور جذبہ لفظوں کی گونج میں ہی گم ہو کر رہ گیا۔

زندگی کو ایک ماورائی خواب بنانے اور اس میں تخیل کی آزاد روی سے رنگ و رعنائی بھرنے میں اختر شیرانی نے سب سے زیادہ شیفتگی کا ثبوت دیا ہے۔شاعری میں یہ رجحان سب سے زیادہ واضح اور دلآویز شکل میں اختر شیرانی کے ہاں ملتا ہے۔اختر رومانوی شاعر ہیں یا کچھ نہیں۔جسے رشید صدیقی کے الفاظ میں کبھی بچے اور کبھی مجذوب ہونے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔وہ رومانیت کی اولین اہم آوازوں میں شمار کئے جانے لگے۔اختر شیرانی کے ہاں زندگی ایک ایسا عمل ہے جسے صرف نسوانی حسن ہی کروٹ دے سکتا ہے۔اختر نے عورت کو جو پہلے صرف پردے میں ہوتی تھی شاعری کی خارجی


CC BY

سطح پر پیش کیا- نتیجہ یہ نکلا کہ رومان ایک ایسا لفظ بن گیا جو محبت کا ہم معنی تھا اور اختر کہ والہانہ شیفتگی کی بدولت یہ اس کے نام کا ایک اہم جزو بن گیا- عورت اختر شیرانی کی نظر میں ایک خواب شیریں ہے جو زندگی کے مطلع پر طلوع ہوتا ہے تو ذہن پر مہکتوں کی بارش ہو جاتی ہے- سکوت نغمہ گویا میں تبدیل ہو جاتا ہے اور فضا معطر ہو جاتی ہے- اختر کو یہ عورت کبھی جوگن کے روپ میں نظر آئی اور کبھی دخترِ صحرا کی شکل میں- کبھی یہ سلمٰی کے نام سے سامنے آئی اور کبھی ناہید کے نام سے—ان تمام عورتوں میں اختر نے ایک ہی عورت کی نسوانی جھلک دکھائی ہے اور اس کے حسن کی والہانہ مدح سرائی کی ہے- حیران کن بات یہ ہے کہ گوشت پوست کا ایک مادی پیکر رکھنے کے باوجود اختر کی شاعری میں عورت کا سراپا تخیل پر مبنی ہے اور اس کی محبت افلاطونی انداز کی ہے- شیرانی نے ہمیشہ ایک مثالی عورت تخلیق کرنے کی کوشش کی۔

اختر شیرانی کو ہر عورت میں کائنات کا جمالی روپ نظر آیا اور آخر کار اس نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لیا کہ کائنات بھی عورت کا ہی ایک نقشِ جمیل ہے- اختر شیرانی کی شاعری میں عورت اپنے جسمانی وجود سے بلند ہو کر مابعد الطبیعاتی حیثیت اختیار کر کے ایک ایسا مثالی پیکر بن کر ابھرتی ہے جس کے ہاتھ میں نبضِ کائنات ہے—

اختر شیرانی اس دنیا سے دور ایک ایسی دنیا بسانا اور آباد کرنا چاہتے تھے جو پھولوں اور مہکتوں سے معمور ہو- اس کا مقصد زندگی سے فرار نہیں بلکہ یہ حسن کی تمام تر جمالی کیفیات کو جذب کر لینے کی آرزو ہے- اختر شیرانی کی رومانیت کا ایک پہلو وطن سے محبت ہے- وطن کا یہ روپ بھی نسائیت کا ہی حامل ہے اور اس کی آرائش و جمال اختر کے ذوق جمال کی پیداوار ہے- چنانچہ وطن ایک ایسی محبوبہ ہے جس سے اختر نے بھرپور پیار کیا ہے اور اس کی جدائی اس کے دل کو غموں اور دکھوں میں دھکیل دیتی ہے- اختر کی رومانیت کا ایک پرتو ہلکورے لیتی ہوئی غنائیت میں بھی موجود ہے- یہ غنائیت اس وقت اور بھی جاذبِ نظر ہوتی ہے جب اختر تنہائیوں میں وفورِ جذبات سے فراق کے نالے بلند کرتے ہیں- اختر کی موسیقی نرم و نازک لفظوں کے فنکارانہ استعمال، مترنم بحروں کے انتخاب، لفظوں کے آہنگ اور مصرعوں کی ترتیب سے پیدا ہوئی ہے—اختر کی رومانیت کے سارے زاویئے عورت کی ذات کا عکس ہیں یا پھر لوٹ کر عورت کے وجود میں جذب ہو جاتے ہیں- اس کی شاعری کی سطحی جاذبیت کی وجہ سے وہ صرف جوانوں کا محبوب شاعر بن گیا- لیکن یہ بات واضح ہے کہ اختر رومانیت کی صحت مند آواز ہے- اس کی شاعری میں جذبے کی شدت کی صورت واضح ہے- اس میں شدت بھی ہے اور دلی وابستگی بھی- اختر نے نہ صرف رومانی تحریک کو ترقی دی بلکہ نئی اردو نظم کو بھی نیا روپ دیا—

رومانی تحریک کے شعرا میں جوش، اختر شیرانی، اور حفیظ جالندھری کی شاعری کا اثر کافی عرصے تک نوجوانوں کو متاثر کرتا رہا- چنانچہ ان کی تقلید کافی شعرا نے کی- جوش نے مردانہ لہجے میں نعرہ لگانے کا انداز پیدا کیا- الفاظ اور تراکیب کا ایک وسیع ذخیرہ نئی نسل کو مہیا کیا- اختر شیرانی نے نسوانی حسن کو واضح کیا- چنانچہ کئی شعرا نے نہ صرف سلمی کے وجود کو تلاش کرنا شروع کر دیا بلکہ شاعری میں انجم ،لیلی اور عذرا وغیرہ کئی نئے نسوانی کرداروں کو بھی پیش کیا- یہاں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اختر نے حسن کو عورت کا وجود عطا کیا اور اسے کائنات کی اہم قوت کے طور پر پیش کیا- حفیظ جالندھری نے اردو شاعری کو گیت کے آہنگ و حسن سے روشناس کرایا اور نغمے کی پر اثر کیفیات کو پیش کیا—

شاعری پر اثر

نثر کے ساتھ ساتھ اردو میں رومانی شاعری بھی شروع ہوئی- اقبال کے ہاں مناظر فطرت، شکوہ الفاظ، حسن ازل کی جستجو، والہانہ سرمستی، ماضی ی عظمت، فطرت کی نغمہ گری، داخل کا جہاں معنی، سرخوش و سرشاری، رومانی کرداروں کی تخلیق (مرد مومن، مرد کہسانی) نظریہ خودی اور ماضی کو بار بار یاد کرنا ایسے پہلو ہیں جو انہیں رومانی شعرا کی صف میں کھڑا کر دیتی ہی- ں ڈاکٹر انور سدید انہیں رومانی تحریک کا اولین شاعر تسلیم کرتے ہیں—

حفیظ جالندھری کے ہاں بھی رومانیت، لطافت، نزاکت، مسکراہٹیں، فطرت سے دلچسپی، بے فکری کی شکل میں نظر آتی ہیں اور ان کی نظموں میں فطرت کا جمال ایک سرمدی نغمہ بن کر ابھرا ہے —بعض ناقدین کے مطابق حفیظ جالندھری پر مغرب کے رومانی اثرات نمایاں ہیں

اختر شیرانی کی شاعری تو سراسر رومانی ہے- ان کے ہاں رومانیت نور ہے جس کی کرنیں چاروں طرف بکھر رہی ہیں- اور اردو شاعری اس سے مستفید ہو رہی ہے انہیں اردو کا سب سے بڑا رومانی شاعر کہا جاتا ہے—

اختر شیرانی کی رومانی شاعری کے ضمن میں ان کے شعری مجموعے پھولوں کے گیت ۱۹۳۴، نغمہ سرا ۱۹۳۹، شعرستان ۱۹۴۱، نغمہ حرم ۱۹۳۹، صبح بہار ۱۹۴۵، اخترستان ۱۹۴۶، لالہ طور ۱۹۴۷، طیور آوارہ اور شہناز ۱۹۴۶ شائع ہوئے—

اردو ادب کی دنیا شیرانی کو خالص رومانی شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے- اور ان کی رومانیت سے اس قدر رغبت پر انہیں "شہزادہ رومان" کا خطاب ادبی دنیا کی طرف سے ان کی زندگی میں ہی مل چکا تھا

-

اختر شیرانی رومانیت کے ضمن میں اپنی ماورائی دھندلکے میں گم ہو جاتے ہیں- کبھی معشوق کے جسم کے پیاسے نظر آتے ہیں تو کبھی ان سے گریز کر کے تصوراتی دنیا میں اپنے لئے جنت تخلیق کر لیتے ہیں -ان کی شاعری کبھی حس و لمس ہے تو کبھی بالکل تخیلی نظر آتی ہے- وہ کبھی ماضی کی بازیافت میں گم ہیں تو کبھی آئندہ مستقبل پر نغمہ جو اور کبھی حال کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں- درج ذیل شعرا جن میں روش صدیقی، حامد اللہ افسر، عظمت اللہ خاں، علی اختر حیدر آبادی، اختر انصاری، ساغر نظامی، الطاف مشہدی، ناصر کاظمی، ابن انشا، منیر نیازی، مصطفی زیدی، سیف الدین سیف، شکیب جلالی، ڈاکٹر وزیر آغا، ظفر اقبال، ظہور نظر، جیلانی کامران، حمایت علی شاعر، جاذب قریشی، کشور ناہید، عبدالعزیز، خالد، شبنم رومانی، سحر انصاری، اور نوشی گیلانی کی شاعری میں رومانیت کہیں کہیں نظر آتی ہے—

## حوالہ جات


۱۔ سلام، ع، م، مرتب، (۱۹۶۱ء)، اختر شیرانی اور اسکی شاعری، آئینہ ادب انار کلی، لاہور، ص ۱۰، ص ۳۳، ص ۶۹۲۔ سدید، انور، (۲۰۱۳ء)، اردو ادب کی تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ص ۴۲۵

۳۔صدیقی، ضیاالرحمن، (۲۰۱۴ء)، اردو ادب کی تاریخ، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ص ۶۵
۴۔سدید، انور، (۲۰۲۱ء)، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ص ۴۲۵، ص ۴۱۴، ص ۴۰۰، ص ۴۲۰، ص ۴۱۵
۵۔حسن، محمد، (۱۹۵۵ء)، اردو ادب میں رومانوی تحریک، تنویر پریس، لکھنو، ص ۱۰، ص ۶۳
۶۔عدم، عبدالحمید، (۲۰۰۹ء)، کلیات عدم، الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ص ۴۱۹
۷۔درانی، فروغ، (۲۰۰۹ء)، بیک فلیپ کلیات عدم، مرتبہ خواجہ محمد زکریا، الحمد پبلیکیشنز، لاہور
۸۔تونکی، مختار، (۲۰۱۲ء)، مطالعہ اختر شیرانی، اردو پرنٹرز، جے پور ص ۱۹، ص ۲۱
۔، ص ۸۴، ص ۶۷، ص ۸۱، ص ۲۶
۹۔شیرانی، اختر، (۱۹۶۹ء)، کلیات اختر شیرانی، مرتبہ گوپال متل، نیشنل اکیڈمی، دہلی، ص ۸۴، ص ۶۷، ص ۸۱، ص ۲۶
۱۰۔جالندھری، حفیظ، (ندارد)، چراغ سحر، ص ۲۱، ص ۴۰
۱۱۔جالندھری، حفیظ، (۱۹۶۴ء)، تلخابہ شیریں، مکتبہ اردو، دہلی، ص ۱۹۵


CC BY